مولانا محمد حنیف ندوی

اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت

(۴)

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا۔ [1]

یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے جس پر لہر آتی ہو اور اس کے اوپر ایک اور لہر چلی آ رہی ہو اور اس کے اوپر بادل ہو، غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ جب اپنا ہاتھ باہر نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے۔

اس آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ہمارے سامنے جہل و نادانی کا بیچ بیچ ایک دریا موجزن ہے جس کی ہر لہر کے اوپر ایک لہر اس انداز سے مزاحمت کناں ہے کہ روشنی کو پھیلنے اور در آنے کا کوئی موقع ہی نہ مل سکے۔ مزید برآں یہ تاریکی صرف دریا کی گہرائی اور تموّج و تلاطم ہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شدتیں اس لیے بھی ہیں کہ اوپر آسمان پر سیاہ اور تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں۔

یہاں لجی یغشاہ کی ترکیب خصوصیت غور کے لائق ہے۔ یہ دو لفظ بحر اور اس کی جملہ کیفیات تلاطم و تموج کو کس کامیابی سے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں

معانی کے نقطۂ نظر سے حسنِ تالیف اور بلاغت کا بہترین اظہار اس وقت ہوتا ہے، جب مابعد الطبیعیات ایسے نازک مسائل میں ایسی بات کہہ دی جائے جس کی حیثیت حرفِ آخر کی ہو۔ جس سے نہ صرف زیرِ بحث مسئلہ کے تمام پہلو نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آ جائیں، بلکہ وہ ایسی جامع و مانع ہو کہ اس پر ایک شوشہ اور لفظ کا اضافہ بھی ناممکن نظر آئے ـــــ آئیے اس پیمانہ کی رو سے قرآن حکیم کی روش کا جائزہ لیں۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں مذاہبِ عالم کا مطالعہ کیا ہے اور ان حکیمانہ نظریات و تصورات پر غور کیا ہے، جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات میں

---

[1] النور: ۴۰

رشتہ وتعلق کی نوعیت پر بحث کی گئی ہے خوب جانتے ہیں کہ ان میں افراط وتفریط کا کیا عالم ہے۔

ایک طرف اگر خدا کے تصور کو انسانی فکر وفہم کے قریب تر لانے کی کوششوں نے ایسا روپ دھارا ہے جو بالکل بشری خوبو لیے ہوتے ہے۔ تو دوسری طرف تجرید وتنزیہہ نے پیرایۂ بیان کی ایسی شکل اختیار کرلی ہے، جو محض سلب اور نفی پر مبنی ہے اور اس لیے نہ صرف یہ کہ کوئی واضح اور مثبت معنی قلب وذہن کی گرفت میں نہیں آپاتا، بلکہ وجود باری کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ یعنی عبرانی علم الکلام نے ایسے بشری الصفات خدا کا تصور پیش کیا، جو قبیلوی دور میں ایک سربراہ اور ایسا لیڈر یا جرنیل تو ہوسکتا ہے جو مخالفین کے وجود کو برداشت نہ کرتا ہو اور ان کو نیست ونابود کردینے پر تلا ہوا اس کو رب العلمین یا عفو وکرم کا وہ پیکر تنزیہی نہیں قرار دیا جاسکتا، جس کی ذات پوری کائنات کے لیے آیۂ رحمت ہو۔ یونانی اور آریائی ذہن نے اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کو عقل خالص (PURE REASON) اور ایسی حقیقت قرار دیا، جو وجود کی کسی بھی سطح پر فائز نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں قضایائے موجبہ کے بجائے قضایائے سالبہ سے کام لینا ہوگا، اور اثبات یا صفات کے ہر مرحلہ اور معرکہ پر کہنا ہوگا نیتی نیتی - یہ بھی نہیں - یہ بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس منفی انداز فکر سے ایمان یا تسلیم ورضا اور عشق ومحبت کے ان تقاضوں کی کسی درجہ میں تسکین ہوسکتی ہے، جن کو انسان بجا طور پر اللہ تعالیٰ سے وابستہ کیے ہوتے ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اشکال اور افراط وتفریط کی یہ دونوں صورتیں اس وجہ سے ابھرتی ہیں کہ خود اس تصور کو نکھارنے اور سلجھانے میں ہمیں ایک طرح کے تضاد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تضاد یہ ہے کہ اثبات باری کی کسی بھی انسانی کوشش کو تشبیہ کی آلائشوں سے مبرا یا دامن کشاں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعینہٖ اسی طرح تنزیہہ، تقدیس یا تجرید کے بلند تر تقاضوں کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہو پاتی، جب تک کہ مکمل نفی یا سلب کو بروئے کار نہ لایا جائے۔

قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے اس روایتی تضاد کا اس حکیمانہ انداز سے آخری اور مکمل حل پیش کیا ہے، جس سے اثبات ونفی کے مابین نہ صرف یہ کہ کوئی اَن بن دکھائی نہیں دیتی، بلکہ الٹا ایسے معانی کا اثبات ہوتا ہے جو ذات خداوندی کے عین شایان شان ہیں۔

یہ حل ایسا متوازن اور صحیح ہے کہ اس سے اثبات و تنزیہہ کے دوگونہ تقاضے باحسن وجوہ پورے ہو جاتے ہیں۔ یعنی نہ تو اس طریق اثبات سے تشبیہ و تمثیل کے امکانات ابھرتے ہیں، اور نہ تجرید و تنزیہہ کی روش سے تعطیل صفات کا خدشہ ہی لاحق ہوتا ہے۔ یہ آخری اور سلجھا ہوا حل کیا ہے، جس نے ابعد الطبیعیات میں فکر و نظر کے اچھوتے اور نئے موڑ کی نشاندہی کی۔
اس کی جھلک سورہ شوریٰ کی اس آیت اور مندرجہ ذیل نقاط میں دیکھیے۔

لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر [۴۲]

اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

۱۔ یہ کہ وہ موجود حقیقی ہے۔

۲۔ وہ ذات ہے جو جمال و کمال کی تمام صفات سے اتصاف پذیر ہے۔ عقل بحت یا تخلیقی قوت نہیں۔ موجود حقیقی اور کامل آتا ہے۔

۳۔ اس کی ذات و صفات کی نوعیت اس طرح منفرد اور یگانہ ہے کہ وجود و صفات کا کوئی بھی اسلوب اس جیسا نہیں۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ ذات سے ہماری مراد جسم نہیں۔ بلکہ ایسی حقیقت ہے جس میں ادراک ذات (SELF CONSCIOUSNESS) کا وصف پایا جاتا ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں لیس کمثلہ شیء کی معنویت اور جامعیت پر غور کیجیے۔ اس میں اثبات کا پہلو بھی ہے اور نفی اور تجرید کا انداز بھی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ نہ تو اس سے تشبیہ و تمثیل کے داعیے شکوک و شبہات کو ابھارنے کا سبب بنتے ہیں اور نہ تنزیہہ و تجرید کے تقاضے سلب محض اور بے سود نفی پر منتج ہوتے ہیں۔

حسنِ تالیف اور فواصل آیات

حسنِ تالیف ہی کے ضمن میں ایک نہایت ہی عمدہ لطیف اور پُر معارف بحث فواصل آیات کی ہے۔ یہ بحث اپنی آغوش میں بدیع و بیان اور مسائل و نکات کے کن کن انمول موتیوں کو لیے ہوئے ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسلاف میں ان حضرات نے جن کو علوم قرآنی

---

[۴۲] شوریٰ : ۱۱

میں غواصی اور شناوری کا اعزاز حاصل ہے اس پر خصوصیت سے روشنی ڈالی ہے چنانچہ ابن الصائغ الحنفی نے اپنی کتاب احکام الرای فی احکام الآی میں چالیس سے زیادہ ایسے نوادر و حِکم کی نشان دہی کی ہے جن کا فواصل آیات سے گہرا تعلق ہے۔ ابن ابی الاصبع نے فواصل کے جملہ فوائد کو چار خانوں میں تقسیم کیا ہے ۔ تمکین، تصدیر، توشیح اور ایغال یا اطناب[۳۱] اور اسی طرح بدائع الفوائد کے متفرق مقامات پر علامہ ابن قیم نے ان فقہی و شرعی مصالح اور دقائق کی پردہ کشائی فرمائی ہے جن کو فواصل آیات اپنے دامن میں چھپائے ہوتے ہیں۔

فواصل کی گوناں گونی کے پیش نظر اس کی تعریف میں بھی اچھا خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے مختصراً یوں کہیے کہ کسی آیت کے آخری کلمہ یا کلمات کو فاصلہ یا فواصل کہتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ ابن الصائغ کے بیان کردہ چالیس سے زائد نکات کی تشریح کریں۔ البتہ ابن ابی الاصبع کے ان چار نکات کی توضیح و تفصیل بیان کر دینے سے قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن حکیم کا اسلوب بیان کس درجہ وسیع، جامع اور نکتہ آفرین ہے۔

تمکین کیا ہے ۔ اس کو سمجھنے کے لیے کسی مجلس مشاعرہ کا تصور کیجیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے ابھی ایک مصرعہ ہی سنایا اور حاضرین نے پکار کر دوسرے مصرعہ کی تکمیل کر دی ۔ یا شاعر نے واردات کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا کہ قافیہ خود بخود ذہن کی طرف منتقل ہو گیا۔ آیت قرآنی میں تمکین کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ترتیب اس نوعیت کی ہو کہ جونہی قاری ... آیت کی تلاوت شروع کرے، بے اختیار فواصل یا فاصلہ سامع کی زبان پر جاری ہو جائے۔

قرآن مجید میں فوصل کے اس انداز کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ سیوطی نے زید بن ثابت کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک نشست میں صحابہ کے سامنے جب سورہ مومنون کی ان آیات کی تلاوت فرمائی:

ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ٥ ثم جعلناه نطفة في قرار مكين ٥
ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما

۳۱ه الاتقان، ج ۲، ص ۹۶ تا ۱۰۰

فکسونا العظم لحمًا ثم انشانه خلقا اخر [۵۴]

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو ایک محفوظ اور مضبوط جگہ میں نطفے کی شکل میں رکھا۔ پھر نطفے کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا، اور پھر اس کو ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

تو سننے والوں میں ایک صاحب پکار اٹھے :

فتبارك الله احسن الخالقين [۵۵]

یعنی بابرکت ہے ہمارا پروردگار جو بہترین خالق ہے۔

تصدیر۔ حسنِ تالیف کی اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں فاصلہ یا فواصل کا ذکر بعینہٖ یا تھوڑے سے تصرف سے آیت کے پہلے حصہ میں موجود ہو۔ بیان و بدیع کی اصطلاح میں اس کو ردّالعجز علی الصدر بھی کہتے ہیں۔

ابن المعتز نے اس کی تین مثالیں بیان کی ہیں :

۱۔ لکن الله یشهد بما انزل الیك انزله بعلمه والملٰئکة یشهدون وکفیٰ بالله شهیدا [۵۶]

لیکن خدا نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے اس کی نسبت خدا گواہی دیتا ہے اور فرشتے گواہی دیتے ہیں کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور گواہ تو خدا ہی کافی ہے۔

۲۔ وهب لنا من لدنك رحمة ج انك انت الوهاب [۵۷]

اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما، تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

۳۔ ولقد استهزئ برسل من قبلك فحاق بالذین سخروا منهم ما كانوا به یستهزءون [۵۸]

تم سے پہلے بھی انبیا سے استہزا ہوتا رہا۔ تو جو لوگ ان میں تمسخر کیا کرتے تھے ان کو اسی عذاب نے

---

۵۴ المومنون : ۱۲ ۵۵ الاتقان، ج ۲، ص ۱۰۱ باب النوع التاسع والخمسون فی فواصل الآی

۵۶ النساء : ۱۶۶ ۵۷ آل عمران ۸ ، ۵۸ الانبیاء ۴۱

آنگھیرا جس کا وہ استہزا کرتے تھے۔ ان آیات میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے، ان سے اس صنف کا اندازہ ہوگا۔

توشیح کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ آیت کے ابتدائی کلمات میں ایسا مفہوم پایا جاتے جو خاص فاصلہ کا مقتضی ہو۔ تصدیر اور اس میں فرق معنی و لفظ کا ہے۔ تصدیر کا تعلق الفاظ سے ہے اور توشیح کا معانی سے۔ لغت کی رو سے وشاح کے معنی جڑاؤ پیٹی کے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح جڑاؤ پیٹی پہننے سے انسان میں حسن و زیبائی آجاتی ہے۔ اسی طرح اس صنعت سے آیت کا حُسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ توشیح کی وضاحت کے لیے دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سورہ آل عمران میں ہے:

ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحًا وآل ابراھیم وآل عمران علی العلمین [9]

اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو دنیا بھر کے لوگوں میں سے منتخب کرلیا۔

یہاں "العٰلمین" کا لفظ بطور فاصلہ کے آیا ہے۔ یہ لفظ اگرچہ آیت کے ابتدائی حصہ میں مذکور نہیں، تاہم جب انتخاب کا ذکر ہوا اور انتخاب بھی ایسا کہ جس کا تعلق حضرت آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا دائرۂ اطلاق "العٰلمین" یا دنیا جہان تک وسعت پذیر ہونا چاہیے۔ یعنی آیت کا مفہوم یہ چاہتا ہے کہ اس آیت کا آخری لفظ "العٰلمین" ہو۔ سورہ "یٰسٓ" میں ہے۔

وایۃ لھم الیل نسلخ منہ النہار فاذا ھم مظلمون [10]

اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں، تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

اس آیت میں لفظ "مظلمون" کی موزونیت کا راز کیا ہے اس پر دو طریق سے غور کیجیے۔ ایک یہ کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات عموماً ایسے الفاظ یا فواصل پر اختتام پذیر ہوتی ہیں جن کے آخر میں حرف "نون" پایا جاتا ہے۔ جیسے یشکرون، العیون، یاکلون، محضرون وغیرہ۔ لہٰذا ضروری تھا کہ یہاں بھی ایسا ہی لفظ پایا جاتا جو حرف نون کے سے

---

[9] آل عمران: ۳۳ [10] یٰسٓ: ۱۰

ترنم اور کھنک کا حامل ہو۔

دوسرے یہ کہ۔ لفظ انسلاخ، جس کے معنی دن کو روشنی اور تابندگی کے تقاضوں سے محروم کر دینے یا دن کے جسم پر سے ضیا و تابش کی کینچلی کو اتار دینے کے ہیں۔ بجائے خود اس بات پر دلالت کناں ہے کہ اس کے بعد دنیا میں ظلمت کا دَور دَورہ ہو، اور "مظلمون" کے یہی معنی ہیں۔

ایغال: حُسنِ تالیف کی ایک تقسیم ایجاز و اطناب بھی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں موقع و محل یا مضمون و معنی ایجاز و اختصار کا مقتضی ہو، وہاں الفاظ اور پیرایہ بیان حد درجہ مختصر اور جامع ہو۔ اور جہاں موقع و محل تفصیل و اسہاب چاہتا ہو، وہاں مزید تفصیل و تشریح اور تبیین کی خاطر پیرایۂ بیان میں بھی اطناب اور طول سے کام لیا جائے۔ اسی طول بیان و اسہاب کو بدیع کی اصطلاح میں ایغال کہتے ہیں۔ یہ طول کبھی حروف و ادات کے اضافے سے ہوتا ہے اور کہیں الفاظ کی کثرت سے اور اس کی قرآن حکیم میں متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن فواصل یا مقطع آیات کے حوالے سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آیات کے آخر میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو بظاہر زائد معلوم ہوں لیکن حقیقت میں زائد نہ ہوں بلکہ نئے اور اچھوتے معانی اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہوں۔

فواصل میں مضمر معانی کا تعین

یہ نئے اور اچھوتے معانی کیا ہو سکتے ہیں، ان کا استیعاب بے حد مشکل ہے۔ تاہم تحقیق و تفحص سے ہمیں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ ان معانی یا مقاصد کو چار خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تعلیل	۲۔ توضیح
۳۔ تلخیص اور	۴۔ اسماء حسنیٰ کی نشان دہی

تعلیل: اس سے مقصود یہ ہے کہ آیت میں جس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے، فواصل کی صورت میں اس کی وجہ اور علت بھی بتا دی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مناطِ حکم کیا ہے یا غیر اصطلاحی معنوں میں دریافت کیا جا سکے کہ وہ کیا سبب اور وجہ ہے جس کی بنیاد پر کسی شئی کو حلال یا حرام قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر حرمت سود کے بارہ میں سورہ بقرہ کی اس آیت پر غور کیجیے:

یمحق اللہ الربٰو و یربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم[۱]

اللہ تعالیٰ سود کو نابود کرتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کفار و اثیم شخص کو دوست نہیں رکھتا۔

یہاں کفار و اثیم کے الفاظ غور طلب ہیں۔ لغت کی رُو سے کذب کے معنی چھپانے کے ہیں اصطلاحاً منکر اسلام کو کافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اسلامی حقیقتوں اور انکار و شک کے داعیوں کو چھپانے میں مصروف رہتا ہے۔ سودخوار کو کفار اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ حصولِ زر کی ہوس میں انسان کے ان فطری حقوق کو مستور اور نظر انداز کرنے کا مرتکب ہوتا ہے جو اس کو انسانی برادری کے رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔

اثم کا اطلاق ابطاء و تاخیر کے ہتھکنڈوں پر ہوتا ہے۔ عربی میں "ناقہ آثمہ" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سست رفتار ہو۔ ابن خالویہ کا کہنا ہے کہ "آثمات" ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں، جن کے متعلق خیال ہو کہ دھوپ یا تمازتِ آفتاب کی شدتوں کے باوجود یہ سفر کو تیز رفتاری سے جاری رکھ سکیں گی لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں۔ گویا "اثم" کے معنی تاخیر ابطا اور سست رفتاری کے ٹھہرے۔

اس وضاحت سے حرمت سود کے دو واضح سبب معلوم ہوئے:

۱۔ یہ کہ اس سے انسان کے فطری حقوق پامال ہوتے ہیں۔ یعنی انسان ہمدردی، اخوت اور تعاون باہمی کی اس نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں جس کے بل پہ انسانی معاشرہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

۲۔ جو قومیں سودخواری کے نظام کو اپنا لیتی ہیں وہ معاشرہ کو بحیثیت مجموعی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے نہ صرف روک دیتی ہیں بلکہ ابطاو تاخیر کے حربوں کو بھی کام میں لاتی رہتی ہیں تاکہ سرمایہ داری کا یہ نظام بہرحال باقی رہے۔

آگے چل کر آیاتِ سود کو ان پُر حکمت الفاظ پر ختم کیا ہے:

---

[۱] البقرہ: ۲۷۶

لا تظلمون ولا تظلمون ۝ [۱۲]

نہ تم اوروں پر ظلم کرو اور نہ تم مظلوم بنو۔

آیت کے اس اندازِ اختتام سے حرمتِ سود کی تیسری علت کا تعین ہوا ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سود کے رواج سے خواہ مخواہ معاشرہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے ۔ ایک حصہ ان لوگوں پر مشتمل قرار پاتا ہے جو ظالم ہیں اور ہر قیمت پر استحصال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں ۔ اور دوسرا حصہ ان بدنصیبوں کا روپ دھار لیتا ہے جو اس دور میں ظلم و استحصال کا شکار ہونے پر مجبور ہوئے ۔ مقطع آیت یا فاصل کی اس نوعیت سے معلوم ہوا کہ اسلام چاہتا ہے کہ نہ تو ظلم کی حمایت کرے اور نہ ایسے نظامِ اقتصادیات کی تائید ہی کرے جس سے مظلومیت بڑھے ۔ اسلام معاشرہ کو اس ڈھب سے ترتیب دینا چاہتا ہے کہ جس سے ظالم و مظلوم کی یہ تقسیم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے ۔

توضیح : اس سے مراد یہ ہے کہ آیت میں کہیں اجمال رہ گیا ہے یا دو پہلوؤں سے ایک ہی پہلو بیان ہوا ہے ، دوسرا چھوٹ گیا ہے ۔ خواتیم آیت سے اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے ۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں ۔

آیت وصیت میں یہ اصول ٹھہرایا کہ موصی جن الفاظ میں وصیت نامہ لکھوائے ، اسے جوں کا توں رکھو ، اور اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کرو ۔

فمن بدله بعد ما سمعه فانما اثمه على الذين يبدلونه [۱۳]

سو جو شخص اس کو سننے کے بعد بدل دے گا تو اس کا گناہ اسی بدل دینے والے پر ہو گا ۔

اس کے بعد صرف اس صورت میں تغیّر و تبدل کی اجازت دی جب کہ موصی سے کسی وارث کی حق تلفی کا اندیشہ ہو ۔

فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بينهم فلا اثم عليه ۔ ان الله غفور رحيم ۝ [۱۴]

اور جو کوئی موصی کی طرف سے کسی زیادتی یا حق تلفی سے خائف ہو کر دونوں میں صلح و صفائی کرا

---

[۱۲] البقرۃ : ۲۷۸ [۱۳] البقرۃ : ۱۸۱ [۱۴] ایضاً ۱۸۲

دے تو اس میں کچھ گناہ نہیں اور خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔

لیکن اس میں اجمال کا یہ پہلو رہ جاتا ہے کہ بعض حالات میں وصیت کا بدلنا نہ صرف جائز ہوتا ہے بلکہ ضروری ٹھہرتا ہے اور فلا اثم علیہ سے صرف جواز ہی پر روشنی پڑتی ہے غفور رحیم کہہ کر اس اجمال کا ازالہ کردیا اور بتا دیا کہ اگر کوئی ایسی ناجائز وصیت بدل کر محروموں کو حق دلاتا ہے تو اس کے معاوضہ میں اس کو یہ اجر ملے گا کہ اللہ کی بخشش و رحمت اس کو گھیر لے گی ۔

تلخیص : بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت سے تعرض کیا جاتا ہے لیکن آیت کے سیاق و سباق کے پیش نظر، اس صفت کے چند ظہورات ہی بیان ہو پاتے ہیں دوسرے ظہورات کی تشریح خواتیم سے ہوتی ہے جس میں اس صفت کے تمام اطلاقات کو دو لفظوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے ۔

مثلاً منافقین کی چند کمزوریوں کو بیان کرکے فرمایا :

قد یعلم ما انتم علیه و یوم یرجعون الیه فینبئهم بما عملوا والله بکل شئ علیم[۵۵]

تم جن مشغلوں میں لگے ہو، اللہ ان کو جانتا ہے اور جس دن ان کو ان کے ہاں پیش ہونا ہوگا۔ اس دن ان کی ایک ایک حرکت کا پتہ دے گا، اور اللہ ہر شی سے آگاہ ہے ۔

ابتدائے آیت میں صرف انہی حصص کی وضاحت ہوئی، جن کا تعلق منافقین کی سرگرمیوں اور نامۂ اعمال سے ہے۔ باقی رہے دوسرے ظہورات، تو ان کا اظہار بکل شئ علیم سے ہوتا ہے ۔

اسمائے حسنیٰ کی نشان دہی : خواتیم و فواصل کا ایک نہایت بلیغ استعمال یہ بھی ہے کہ اکثر ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا ذکر ملتا ہے جس کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کے دوران قلب و ذہن برابر اس ذات گرامی کی طرف متوجہ رہتا ہے جس نے اس کتاب ہدیٰ کو نازل

---

[۵۵] النور : ۶۴

فرمایا - نیز ان اسماء صفات سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے احوال وشئون کی گوناگونی کا احساس بیدار رہتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس بات کا اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کے ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے - چونکہ اسماء وصفات قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر مذکور ہوئے ہیں اور سیاق وسباق کی مختلف موزونیتوں کے پیشِ نظر مذکور ہوئے ہیں، اس لیے اس کے معانی اور اطلاقات میں بے حد تنوع اور جامعیت ابھر آئی ہے -

یہ اسماء الحسنیٰ قرآن حکیم میں فواصل کی شکل میں کہاں کہاں آئے، ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں -

علیم اللہ تعالیٰ کی مشہور صفت ہے - سورۃ البقرہ میں ہے:

واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بکل شئ علیمٌ [۱۶]

خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر شے کو جانتا ہے -

طلاق ورجوع کے مسائل کے سیاق میں علم الٰہی کے تذکرہ کے معنی ہیں کہ اکثر لوگ نکاح، رجوع اور طلاق کے مسائل میں، الفاظ کی ظاہری دلالت کو بہانہ بنا کر، خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کے خواہاں رہتے ہیں - انھیں اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمھاری خواہشاتِ نفسانی سے آگاہ نہیں اور تم نے احکام ومسائل کی روح کو نظر انداز کرکے محض حیل کے بل پر اس کی گرفت سے چھوٹ جاؤ گے -

سورہ الانعام میں اسی صفت کا ایک اور پہلو بیان ہوا ہے -

فالق الاصباح وجعل الیل سکنًا والشمس والقمر حسبانا ط ذٰلک تقدیر العزیز العلیمِ ۰ [۱۷]

وہی رات کے اندھیرے سے صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے، اور اسی نے رات کو آرام کا موجب ٹھہرایا، اور اسی نے سورج کی تبدیلیوں کو وقت کا پیمانہ مقرر کیا - یہ اللہ تعالیٰ کا متعین کردہ اندازہ ہے، جو غالب اور علیم ہے -

پہلی آیت میں علم کا تعلق عالم اصغر (انسان) کے احوال نفسی سے تھا - دوسری آیت عالم اکبر یا کائنات کے اس پہلو پہ روشنی ڈالتی ہے کہ کارخانۂ قدرت میں جو ایک نظام، رکا بندھا قاعدہ

---

[۱۶] البقرۃ : ۲۳۱ [۱۷] الانعام : ۹۶

اور ترتیب رونما ہے، یہ بخت و اتفاق کی کارفرمائیوں کا نتیجہ نہیں۔ اور نہ اس کو ایسی تخلیقی قوتوں ہی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے جو اپنی فطرت میں تخلیق و آفرینش کی صلاحیتوں کو لیے ہوئے ہوں۔ کائنات کا یہ انداز اپنے جلو میں جن حکمتوں اور لطائف کو سمیٹے ہوئے ہے، وہ اس حقیقت کی غماز ہیں کہ اس کو پیدا کرنے والا، بے پناہ قدرت و علم سے اتصاف پذیر ہے۔ چنانچہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس عالم میں کیونکر انسانی مصالح کی تکمیل کا سامان مہیا کیا جا سکتا ہے، اور کس طرح اسے مفید، باقاعدہ اور علم و عرفان کا کامیاب ہدف قرار دیا جا سکتا ہے۔

"رحیم" اللہ تعالیٰ کا ایک اہم وصف ہے۔ جو رحم سے مشتق ہے اور اس کے معنی محبت و شفقت کے ایسے پیکر تنزیہی کے ہیں جو ماں کا سا انعطاف اور ماں کا سا بے پناہ لطف و کرم لیے ہوئے ہو، یا محبت و شفقت اور لطف و کرم جس کی فطرت ہو۔ یہ کبھی صفت غفور کے ساتھ آیا ہے اور کبھی صفت تواب کے ساتھ۔ کبھی لفظ رؤف کے ساتھ مذکور ہوا ہے اور کبھی لفظ عزیز کے ساتھ اور ایسا کبھی ہوا ہے کہ رحیم اور رحمٰن کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے۔ اور ہر سیاق میں معانی جدا اور مختلف نوعیتوں کے حامل ہیں۔ اور ان سے مقصود یہ ہے کہ اس کی رحمت کبھی غفران کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے کبھی رأفت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی عزت و غلبہ کی صورت میں۔ اور جب رحمٰن اور رحیم ایک ساتھ مذکور ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی رحمتوں کا دائرہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں، آخرت میں بھی اس کا عفو و کرم مسلمانوں کے شامل حال رہے گا۔ غرض یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ تعلقات عبودیت استوار کرو پھر دیکھو اس کی شفقتیں تمھیں کس طرح گھیر لیتی ہیں، اور کس طرح قدم قدم پر تمھاری دستگیری کرتی اور تمھیں عقبیٰ کی نعمتوں سے نوازتی ہیں۔

نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم[18]

میرے بندوں کو بتا دو کہ میں غفور اور رحیم ہوں۔

سورہ توبہ میں ہے:

وان اللہ ھو التواب الرحیم[19]

---

[18] الحجر: ۴۹ [19] ۱۰۴

اور بے شک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرؤف رحیم[20]

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے اعمال کو یونہی ضائع کردے۔ اللہ تو بڑا مہربان اور صاحبِ رحمت ہے۔

وان ربک لھو العزیز الرحیم[21]

اور تمہارا پروردگار ہی غالب اور رحم والا ہے۔

والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم[22]

اور لوگو! تمہارا خدا ایک ہے اور اس رحمٰن و رحیم خدا کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

اس طرح قرآن حکیم کی آیات میں فواصل و خواتیم کی صورت میں اور کبھی متعدد جگہ صفات اور اسمائے حسنیٰ کا ذکر ہوا ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ باندازِ دگر اور اطلاق و معنی کے نئے نئے اسلوب کے ساتھ!

قرآن حکیم کی ان لسانی خوبیوں پہ ایک سرسری نظر ڈال لینے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنا علامہ اور زیرک کیوں نہ ہو، دعوت و پیغام کی زبان کو اس درجہ مرصع، موثر اور بدیع و بیان کے لطائف و رموز سے آراستہ پیراستہ شکل میں پیش نہیں کرسکتا۔ یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے ادات و حروف، اعراب اور الفاظ سے لے کر آیات تک میں آہنگ و صوت، اور فصاحت و بلاغت کی فنی نادرہ کاریوں کو اپنے دامن میں اس کامیابی کے ساتھ جمع کر رکھا ہے۔

اعجازِ قرآن کے معنوی پہلو اس پر مستزاد ہیں اور وہ متعدد ہیں۔ اگر ہمیں تنگیٔ داماں کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان کا بھی ایک خاکہ ہم ضرور پیش کرتے۔ سرِ دست ہم صرف اتنا کرسکیں گے کہ اس کے ان علمی خوارق کی ایک جھلک، کتاب کے آخری باب میں دکھادیں جس سے یہ اندازہ ہوجائے کہ یہ کتاب محدود

---

۲۰ البقرہ: ۱۴۳ ۲۱ البقرہ: ۹، ۶۸، ۱۰۴، ۱۲۲، ۱۴۰، ۱۵۹ وغیرہ۔
۲۲ البقرہ: ۱۶۳

انسانی ذہن کی اختراع نہیں، جو زمان و مکان کی قیود میں جکڑا ہوا ہے بلکہ یہ اس علیم و خبیر خدا کا نازل کردہ صحیفہ ہے، جو زمان و مکان سے وراء الوراء ہے، اور تمام کائنات کے اسرار و رموز سے آشنا ہے۔

اساسیاتِ اسلام

از مولانا محمد حنیف ندوی

اس دورِ تشکیک میں عالم اسلامی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا کی روشنی میں کیونکر اسلام کو مربوط اور استوار فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا کی یہ کاوش علمی اسی مسئلہ کے حل و کشود کو بہ احسن وجہ پورا کرتی ہے۔ اس میں اثباتِ باری، اسلام کے نظامِ حیات، ایمان بالآخرت اور اسلام کے اخلاقی نظام کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی کی گئی ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مفہوم کیا ہے۔ نظامِ حکومت کے متعلق اسلام کس نظریے کا حامل ہے اور یہ کہ تقسیم دولت کے بارے میں اسلام کا تصورِ عدل کس اقتصادی ڈھانچے کا مقتضی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں مذہب، فلسفہ، تصوف اور سائنس کے حقائق کو کامیابی کے ساتھ سمو کر بیان کیا ہے جس سے کتاب کی دلکشی اور معنویت میں بدرجۂ غایت اضافہ ہوا ہے۔

اسلوبِ بیان غیر معذرت خواہانہ علمی اور شگفتہ ہے۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے

(ملنے کا پتہ)

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ — کلب روڈ لاہور